ڈاکٹر اظہر علی رضوی

وحدت الوجود - وحدت الشہود

اللہ کا تصور ہمیشہ انسان کی روحانی، اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ یہ بات کہ مذہب کا موضوعی اور نفسیاتی مزاج کیا ہے، اور وہ اپنے پیروؤں کے لیے کس طرح کے اثرات رکھتا ہے، صرف یہ بات دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہے کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے؟ اللہ کی ہستی کا اعتقاد انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ وہ اس کی فطرت کا ایک وجدانی احساس ہے اور وجدانی احساسات میں نہ تو ذہن وفکر کے اثرات مداخلت کر سکتے ہیں، نہ باہر کے اثرات سے ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ انسان کی عقل، ذات مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ تصور میں صفات وعوارض ہی آتے ہیں۔ خدا کا جب بھی تصور کیا گیا ہے وہ اس کی ذات کا تصور نہ تھا، اس کی صفات کا تصور تھا اور صفات میں سے بھی ان ہی صفات کا جن کا ذہن انسانی تخیل کر سکا۔ یہیں سے اللہ پرستی کے فطری جذبے میں ذہن وفکر کی مداخلت شروع ہوگئی۔ مختلف دبستانِ فکر اور مذاہب نے خدا کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے۔ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی تو اپنے ماحول اور سوچ کے مطابق بنائی۔ جوں جوں اس کا معیارِ فکر بدلتا گیا، وہ اپنے معبود کی شکل وشباہت بھی بدلتا گیا۔

حضرت رسول اللہؐ پر دین کی تکمیل ہوئی اور اللہ کا مکمل حرکی تصور ہمارے سامنے آیا۔ ظہورِ قرآن کے وقت پانچ دینی تصورِ فکر انسان پر چھائے ہوئے تھے۔ چینی، ہندوستانی، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔ چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک آسمانی ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ ہندوستانی تہذیب میں ایک خدا کے ساتھ لاتعداد دوسرے خدا، مجوسی

تصور کی بنیاد ثنویت کے عقیدے پر تھی۔ یہودی خدا سے انسان کا رشتہ، میاں بیوی کا رشتہ ٹھہراتے۔ مسیحی تصور میں ماں، باپ، بیٹے کے رشتے کی بات کی گئی۔

قرآن کے تصورِ الٰہی نے فکر وتصور کی ایک نئی دُنیا کی بنیاد رکھی۔ اسلام میں اللہ کی وحدانیت کا جو تصور پیش کیا گیا، وہ دوسرے مذاہب سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔ وہی ہر چیز کی تخلیق کرتا ہے اور اس کے لیے ایک انداز مقرر ہے۔ وہ تمام مخلوق کا علم رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ مشرق و مغرب میں اللہ ہے تم جدھر بھی رُخ کرو گے، وہاں اللہ کی ذات موجود ہوگی۔ ''اور وہ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی نہیں ہے۔ جوہر اور عرض نہیں ہے۔ محدود اور متناہی نہیں ہے۔ طویل اور عریض نہیں ہے۔ دراز اور کوتاہ نہیں، فراغ اور تنگ نہیں بلکہ وہ فراخی والا ہے، لیکن وہ وسعت نہیں جو ہمارے فہم میں آئے۔ وہ محیط ہے لیکن وہ احاطہ نہیں جس کا ادراک کیا جا سکے۔ وہ قریب ہے لیکن وہ قرب نہیں جو ہماری سمجھ میں آ سکے۔ ہم ایمان لاتے ہیں کہ وہ فراخی والا ہے۔ احاطہ کرنے والا ہے۔ قریب ہے اور ہمارے ساتھ ہے، لیکن ان صفات کی کیفیت کو ہم جان نہیں سکتے کہ وہ کیسی ہیں صرف محسوس کر سکتے ہیں۔

عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ اللہ لامحدود ہے، انسان محدود ہے۔ لامحدود اور محدود کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ محدود کی کیا نوعیت ہے، وہ کس بلندی تک سفر کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ مذہب بتاتا ہے اور ان سب کا اظہار انسان کے افعال کے ذریعے ہوتا ہے۔ دُنیا میں ہر چیز کی طرح ہر فعل کی نوعیت بھی اپنا مزاج رکھتی ہے۔

مذہب محض ایک احساس اور ایک جذبے کا نام نہیں ہے۔ مذہبی تجربے میں احساس ایک خیالی ایک وقوفی پہلو پیدا کرتا ہے اور یہ وقوفی پہلو چند حقائق پر مشتمل ہے جن پر خلوصِ نیت سے غور کیا جائے تو وہ انسانی کردار کو بدل دیتے ہیں۔ مذہب نہ تو فقط احساس، نہ ہی فقط خیال بلکہ انسان کا مکمل اظہار ہے۔ انسان کا یہ مکمل اظہار اس کائنات میں صفاتِ الٰہی کا پرتو

ہے۔ قرآن مجید کا اساسی مقصد انسان میں خدا اور کائنات سے روابط کا اعلیٰ شعور پیدا کرنا ہے۔ کائنات ایک سنجیدہ مقصد کے لیے تخلیق کی گئی۔ اس کا تغیر و تبدل ہمیں ہمیشہ سے رویے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ دنیوی تغیرات پر غور کرنے ہی سے ہم میں لامکان کا عقلی مشاہدہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور حقیقت اپنے اظہار میں زندہ رہتی ہے۔ محض مشاہدۂ کائنات ہی سے شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ کائنات کی علامتوں سے حقیقت تک پہنچنا ایک استخراجی طریقہ ہے۔ لیکن تکمیلِ انسانیت کے لیے قلب اور اس کی واردات کی نشوونما کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ قلب ایک داخلی وجدان ہے۔

عبادت اور دُعا دونوں اللہ کی ہستی کا مشاہدہ کرنے کی شاہراہ ہیں۔ اللہ نے فرمایا ''پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے یعنی شریعت پر کر دیا۔ آپ اسی طریقے پر چلے جایئے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیئے۔'' یہ شریعت عام لوگوں کے لیے دانش مندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین کرنے والوں کے لیے رحمت ہے۔

شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ راہرو کو ان ہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آدمی کسی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعے راستہ نظر آتا ہے۔ یہ نگاہ یا نظر افراد میں استعداد کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے اور ریاضت و عبادت سے اس میں گہرائی و گیرائی آ جاتی ہے اور فرد کے کردار میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ باطنی پہلو ہے اور طریقت سے متعلق ہے۔ شریعت اور طریقت انسان کی شخصیت کی تکمیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور ان میں توازن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شخصیت کی مکمل تشکیل کے اس توازن سے انسان، کائنات اور خدا کے درمیان وحدت قائم ہوتی ہے۔

فکر کی تاریخ میں وحدت الوجود کے نظریے کو ہیگل سے زیادہ کسی نے تقویت نہیں دی اور یہ اسی کی لگائی ہوئی بیل تھی جس کو انگلستان میں گرین اور بریڈلے نے مینڈھے

چڑھایا۔ اس نظریے کا لب لباب یہ ہے کہ کثرت میں وحدت ہے۔ دُنیا کا تنوع ایک ہی قسم کے مختلف پہلوؤں سے بنتا ہے کہ جو ہمیں قدم قدم پر بوقلمونی نظر آتی ہے اور ہر نگاہ میں ایک نیا جلوہ پیدا ہوتا ہے۔ ان میں علیحدہ علیحدہ حقیقت تو ہے مگر تھوڑی۔ پوری اور دائمی حقیقت ''قطعی'' ہے۔ اس نظریے کا ایک فوری نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی انفرادیت خدا کی ہستی میں سما جاتی ہے اور ان کی نیکی اور نگاہ کی ذمہ داری ہی خدا کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عالم میں تین چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ مادہ، قوت، عقل۔ یہ عقل تمام اشیاء میں اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح انسان کے بدن میں جان، اسی عقل کا اثر ہے کہ تمام سلسلہ کائنات میں ترتیب اور نظام پایا جاتا ہے۔ غرض تمام عالم میں ایک ذاتِ واحد ہے۔ اس ذاتِ واحد میں جو عقل ہے وہی خدا ہے۔ جس طرح انسان متعدد الاعضاء ہونے کے باوجود ایک واحد خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان میں ایک ہی عقل ہے، اسی طرح عالم کی عقل ہے اور اسی کو خدا کہتے ہیں۔ گویا کہ موجود صرف ایک ہے۔ خواہ اسے ہم مادہ کہہ لیں جیسا کہ مغربی مفکرین کہتے ہیں یا اسے خدا کہہ لیں جیسا کہ ابنِ عربی کے پیروؤں کا خیال ہے۔ وحدت الوجود یا ہمہ اوست۔ سب وہی ہے سب خدا ہی ہے۔ یہ مسئلہ موجودہ نام نہاد تصور کا روحِ رواں ہے۔ اس مسئلہ کا اظہار قرونِ ثلاثہ میں نہیں ہوا۔ مؤرخین اس بات کو چھ ہجری کی پیداوار کہتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں اور صوفیوں نے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ شیخ اکبر ابنِ عربی کی ایجاد ہے اور ایسا نازک مسئلہ ہے جس سے انسان الحاد و حلول تک پہنچ جاتا ہے۔

کہا یہ گیا ہے کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود مطلق ہے۔ باقی سارے وجود اسی وجودِ مطلق کے تعینات ہیں۔ اس خیال کا منشا ہمہ اوست ہے، جیسے ایک سمندر مختلف ممالک سے گزر کر مختلف نام پاتا ہے۔ وحدت الوجود ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ابنِ عربی نے اسے اور بھی دقیق و مبہم بنا دیا ہے۔ آسانی کے لیے یہ سمجھ لیا جائے کہ وحدت الوجود کے ماننے والے کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی موجود نہیں یا کہ جو کچھ موجود ہے، سب خدا ہی

ہے۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں۔ نیز کائنات کی مختلف اشیاء اور انسانوں میں کوئی فرق نہیں جو فرق ہے ظاہر میں ہے باطن میں بالکل نہیں۔ نظریہ وحدت الوجود درحقیقت ایک وجدانی کیفیت، ایک ذوقی حالت، ایک رجحانی اور روحانی احساس ہے۔ اس نظریہ کے مطابق:

(۱)　خدا اور کائنات سے ماورا کوئی ذات نہیں۔ وہ تو یہی کائنات ہے۔ خدا اور کائنات ایک دوسرے کا عین ہے۔

(۲)　یہ کائنات اسی طرح ازلی و ابدی ہے جس طرح خود خدا کی ذات، اس لیے دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُوپ ہیں۔

(۳)　وجود صرف ایک ہی ہے۔ اس طرح خیر و شر کی تمیز لایعنی ہے۔ وجود من حیث الوجود خیرِ محض ہے، اس لیے شر کا کوئی وجود نہیں۔

(۴)　شریعت، طریقت، حقیقت تینوں کو باطنی معنی کے تابع قرار دے کر تینوں کو حقیقتِ واحد کہا جاتا ہے۔ یہاں معنی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان معارفِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامی اور جنید بغدادیؒ نے اپنے ذوق و وجدان کی بنا پر مسئلہ وحدت الوجود کا سب سے پہلے ذکر کیا تھا۔ ان کے بعد محی الدین ابنِ عربی نے اس مسئلہ کو ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا کر ایک فلسفہ بنا دیا۔ ابنِ عربی نے جو اس مسئلہ پر بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور تمام اشیاء کسی ایک وجوہ کی تجلیات اور مظاہر ہیں۔ وجود حقیقی اور کائنات میں ذات و صفات کی نسبت ہے اور چونکہ صفات، ذات اور کائنات بھی حق تعالیٰ سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتیں، بلکہ سب کچھ وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاک ہے ''وہ ذات جس نے اشیاء کو پیدا کیا اور یہ بھی کہا کہ خدا بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ پس مجھے نہیں معلوم کہ مکلف کون ہے۔''

مولانا شبلی کہتے ہیں۔ حضرات صوفیا کے نزدیک توحید کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا

اور کوئی چیز عالم میں موجود نہیں یا جو کچھ موجود ہے، سب خدا ہی ہے۔ اس کو ہمہ اوست کہتے ہیں کہ مسئلہ اگر چہ تصوف کا اصل موضوع ہے لیکن اس کی تعبیر اس قدر نازک ہے کہ ذرا سا بھی انحراف ہو تو یہ مسئلہ بالکل الحاد سے مل جاتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے۔ مخلوق جس میں عالمِ طبعی اور انسان بھی شامل ہے محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں اور انسان کی ہستی یا خودی اس کو مشاہدۂ حق اور وصلِ خدا سے باز رکھتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی خودی کو زائل کرے اور تمام دُنیاوی قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو کر فنا فی اللہ ہو جائے۔ اس نظریے کے مطابق انسانی زندگی کا انجام عام طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ قطرہ سمندر میں گم ہو گیا۔ چونکہ وجود ایک ہی ہے، اس لیے کسی دوسرے وجود کا امکان ہی نہیں۔

وحدت الشہود

حضرت مجدد الف ثانیؒ کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے وحدت الوجود کے نظریے کی تردید کہہ لیں یا اصلاح کے لیے وحدت الشہود کی تبلیغ شروع کی۔ ایسا کیوں کیا؟ مجدد الف ثانیؒ کی اپنی تحریر ہے۔ ''ان دقیق علوم کی تحریر کا باعث اور سبب یہ ہے کہ اس وقت کے بہت سے لوگ بعض تقلیداً، بعض علم کے باعث اور بعض علم اور قدرے ذوق کی بنا پر اور بعض الحاد اور زندقہ کے باعث اس توحیدی وجود کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اور سب کو حق کی طرف حق جانتے ہیں اور اپنی گردنوں کو تکلیف شرعی کی رسی سے اس بہانے کے ساتھ باہر نکال رہے ہیں اور حکامِ شرعیہ میں مستیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اسی حالت پر خوش وقت اور مسرور ہیں اور شرعی احکام کی بجا آوری کا اگر اعتراف بھی کرتے ہیں تو اسے طفیلی جانتے ہیں اور مقصود اصل شریعت کے علاوہ کسی اور کو خیال کرتے ہیں۔''

علامہ اقبالؒ وحدت الشہود سے متاثر ہوئے۔ وہ اپنے خطبات میں فرماتے ہیں۔

''اس لحاظ سے دیکھئے تو نفسیاتِ حاضرہ نے مذہبی زندگی کا کوئی قشر تک نہیں چھوا۔

وہ اس تنوع اور گونا گونی سے بالکل بے خبر ہے جو مذہبی واردات اور مشاہدات میں پائی جاتی ہے لیکن جس کا تھوڑا بہت اندازہ شاید آپ سولہویں صدی کے ایک بہت بڑے مرشد کامل احمد سرہندیؒ کی ایک عبارت سے کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے تصوف کا تجزیہ جس بے باکی اور تنقید و تحقیق سے کیا، اس سے سلوک و عرفان کا ایک نیا طریق وضع ہوا۔ ان سے پہلے جتنے بھی سلسلہ ہائے تصوف رائج ہوئے وہ یا تو وسط ایشیا یا سرزمینِ عرب سے آئے تھے۔ یہ صرف انہیں کا طریق ہے جس نے ہندوستان کے حدود سے نکل کے باہر کا رُخ کیا اور جو اَب بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک بڑی قوت ہے۔''

خدا اس کائنات کا خالق ہے اور انسان اس کی مخلوق۔ ایک خاص وقت میں خدا نے عدم سے اس کائنات کو پیدا کیا۔ جسم اور روح کی دوئی کے قائل ہیں۔ شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ جب یہ تینوں جزو نہ پائے جائیں، شریعت مطلق نہیں ہو پاتی اور جب شریعت مکمل ہو گئی تو حق سبحانہ کی رضا تمام دنیوی و اخروی سفاوتوں سے خالق و اعلیٰ ہے۔ اسلئے شریعت تمام دنیوی اور اخروی سفاوتوں کی ضامن و کفیل ہے اور کوئی مقصود و مطلوب نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان کو اس کی محتاجی ہو۔ طریقت و طریقت جس کے ساتھ صوفیاءِ کرام ممتاز ہیں، دونوں شریعت کی خادم ہیں۔ ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے نہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو۔

صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے۔ باقی وجود اس ذاتِ واحد کے آثار و عکس ہیں۔ اس خیال کا منشا ہمہ از اوست ہے۔ جیسے رات آفتاب سے چمک حاصل کرتی ہے، درحقیقت خود کچھ نہیں ہیں۔ نہ خدا بندے میں حلول کر سکتا نہ بندہ خدا میں مل سکتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذاتِ باری اور مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انہیں توحید عینی اور توحید ظلی بھی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن علامہ اقبالؒ نے اپنے مقصد اور پیام کے پیشِ نظر وحدت الوجود کے تصور کی پرزور مخالفت کی ہے۔ اس لیے ان کی رائے میں ''اِس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔''

نواب سر احمد حسن نظام جنگ بہادر نے ''فلسفہ فقرا'' میں ان دونوں اصطلاحات اور تصورات کا فرق ایک نقشے سے واضح کیا ہے۔

وحدت الوجود (ھوالکل)	وحدت الشہود (ھوالشہادی)
نظریہ ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست	ہم از اوست
رجحان تصور = سکون کی طرف مائل	جوش کی طرف مائل
مَیں اور وہ جدا نہیں (وہ دریا اور میں قطرہ)	اس کے ساتھ میں اور میرے ساتھ وہ ہے
وصل	عشق
اعتقاد۔ مَیں کون؟	اعتقاد۔ مَیں کون؟
انا الحق (عارف)	انا عبدہ (عاشق)

اقبالؒ کی راہ عرفانِ خودی سے معرفتِ کامل اور توحید تک پہنچاتی ہے۔ ابنِ عربی کو سرالوصل اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کو سرالفراق کہا جائے تو ان کے فلسفوں اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ جس فن کی تحریر ہو، اس فن کی اصطلاحات کے اعتبار سے اس کا مطلب سمجھنا چاہیے، دوسرے فن کی اصطلاحات کے اعتبار سے نہیں۔

حضرت تھانوی نے ہزاروں سالکوں کو یہ اصول سمجھا کر تباہی سے بچایا کہ احوالِ محمود مقصد نہیں احوال کے بغیر بھی روحانی ترقی ہو سکتی ہے۔ مولانا تھانوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شکر محدود کا لامحدود کی طرف سفر ہے، ہر اچھے کام کے لیے دوسرے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ اللہ کے وجود کا اقرار ہے، ذہنی صحت کی علامت ہے۔